میں برسرِ نزاع رہے ہوں گے، نظری لحاظ سے بھی، اپنے اعتقاد کی بنا پر بھی اور پھر ان میں جنگیں بھی ہوئی ہوں گی۔ ایسا ہونا کوئی انوکھی بات نہیں بلکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ انوکھی بات ہوتی کیونکہ آخر ملتِ اسلامیہ بھی انسانوں ہی کا گروہ تھا اور انسانوں میں اختلافات کا ہونا فطری بھی ہوتا ہے اور ناگزیر بھی۔

اب ضرورت یہ ہے کہ ان گروہی و فرقہ وارانہ اختلافات اور ماضی کے ان مناقشات و محاربات کو اصل دین سے الگ کر کے دیکھا جائے۔ اول تو ان سے حتی الوسع تعرض کرنے سے بچنا چاہیئے اور اگر ان کو زیرِ بحث لانا بھی پڑے تو ان سے علمی انصاف صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ ان ناخوشگوار واقعات کو ان کے تاریخی پس منظر میں اور ان کے عہد کی ضرورتوں اور مجبوریوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے۔

الرّحیم اپنی گزشتہ چھ سال کی زندگی میں اپنی بساط میں اسی طریقہ کار کا پابند رہا اور اب بھی انشاء اللہ العزیز اسی شاہراہ پر گامزن ہونے کی پوری سعی کرے گا۔

اس میں شک نہیں کہ امتِ اسلامی صدیوں تک فرقوں میں بٹی رہی، اور یہ فرقے آپس میں قلمی و لسانی جنگیں کرتے رہے جن سے کہ ہماری ملی بات اور ہمارا مذہبی ادب بھرا ہوا ہے۔ یہ سب صحیح اور ہمارے ہاں یہ سب کچھ ہوا۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ آج ہر مسلمان ملک میں فرقہ واریت کے بجائے اتحادِ ملت کا رجحان ابھر رہا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہر فرقہ دوسرے فرقے کے قریب آ رہا ہے اور قومی و ملکی بلکہ اس سے زیادہ بین الاقوامی ضرورتیں مسلمانوں کو مجبور کر رہی ہیں کہ وہ فرقہ واریت کو کر ایک ملت میں برابر کے شریک ہونے کو مقدم سمجھیں۔ اس منزل کی طرف سب کے قدم اٹھ چکے ہیں اور جیسے جیسے وقت گزرے گا یہ قدم تیز ہوتے جائیں گے اور آخر کار ملت افتراق کی جگہ اتحاد کو حاصل کر کے رہے گی۔

خود اس برصغیر میں آپ نے دیکھا کہ جب حصولِ پاکستان کا معرکہ کارزار گرم تھا اور اس سرزمین کے مسلمانوں کو بیک وقت برطانوی شہنشاہیت اور ہندو تسلط کے خلاف لڑنا پڑ

رہا تھا تو اس وقت تمام مسلمانوں کا اتحاد ہی ان کی کامیابی کا ذریعہ بنا۔ یہ اتحاد ان کی تاریخ کے اس اہم ترین دور میں ان کی سب سے بڑی قوت ثابت ہوا اور پھر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مسلمانانِ پاکستان متحد ہو کر ہی ہندوستانی جارحیت کو ناکام بنا سکے۔

تمام مسلمان ملکوں کے اندر اتحاد کی یہ تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ ایک طرف اہلِ سنت کے مختلف فقہی مکاتب باہم مل رہے ہیں۔ دوسری طرف اہلِ سنت اور غیر اہلِ سنت کے اختلافات کی اہمیت ختم ہو رہی ہے اور سارا زور آپس کی بنیادی مشترک باتوں پر دیا جا رہا ہے۔

الرحیم حسبِ سابق اپنی اسی اتحاد بین المسلمین کی پالیسی پر عمل پیرا رہے گا جیسا کہ وہ گزشتہ چھ سالوں میں رہا ہے۔ وہ اس کے لیے فکری نقطہ پیدا کرنے میں پوری تگ و دو کرے گا۔ اسے امید ہے کہ ملت کے بہی خواہ طبقے اس ضروری اور مفید کام میں اس سے تعاون کریں گے اور اہلِ علم اپنے رشحاتِ قلم سے اس مقصد کے حصول کے لیے اس کا ہاتھ بٹائیں گے۔

فضل حمید

کائنات کا باطنی نظام

کائنات کا باطنی نظام بیان کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ کائنات کے ظاہری نظام کا اجمالی تذکرہ کر دیا جائے

یہ نہ صرف اس لیے کہ کائنات کے باطن کے افہام و تفہیم کے لیے اس کے ظاہر کا بیان کرنا ناگزیر ہے بلکہ اس لیے بھی کہ کائنات کے ظاہر و باطن میں کوئی تضاد و تخالف یا تغایر و تباین نہیں ہے۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں

صوفیائے وجودیہ کی اصطلاح میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے وجود باجود کے دو تیور ہیں جنھیں بطون و ظہور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ کا باطن ایک نورِ بسیط ہے اور عالم شہادت ہے جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ اس نور کے مظاہر اسمائی و فعلی و صفاتی ہیں

غرضیکہ جو کچھ عالم رنگ و بو میں ہمیں نظر آتا ہے یا محسوس ہوتا ہے وہ علم الٰہی کی تفصیلی صورتیں ہیں جو حضرت وجود نے اپنے جمال و کمال کے اظہار کے لیے اختیار فرمائی ہیں۔

وجودی تصوف نے نظریہ کی تفصیل کا یہ مقام نہیں لیکن یہاں یہ التباس لازم ہے کہ افراد و اقدام کو یہ علمی مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ فطرت کا باطنی نظام اس کے ظاہری نظام سے مختلف ہے اور اس بنا پر وہ فطرت کو رد و رعایت یا بغض و عناد سے متہم کرتی ہیں اور اپنی غلط فہمی کی بنا پر آفت و تباہی میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ قوموں کے زوال و انحطاط اور ان کی ہلاکت اور بے عملی میں اس اعتقاد کو بڑا دخل ہے کہ وہ فطرت کی محبوب و مالوف ہونے کی وجہ سے خاص رعایت کی مستحق ہیں محض حسن اتفاق سے کوئی خوش نصیبی کی بات بھی ہو جاتی ہے۔

لیکن اس میں فطرت کی پسند و ناپسند کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ ہم اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے فطرت کو انسانی جذبات اور انفعالات کا مورد سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ وہ ان سے بے نیاز ہے۔ جامع لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام کائنات میں ربوبیت مطلقہ کے گوناگوں مظاہر و آثار پائے جاتے ہیں لیکن کوئی خصوصی یا امتیازی سلوک کسی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ ہر معاملہ استعداد و توفیق سے تعلق رکھتا ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد ہم کائنات کے ظاہری علوم کی چند نمایاں خصوصیات بیان کرتے ہیں۔

تعلیلی حکمت

کائنات کے کارخانہ اور اس کے پھیلاؤ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو کوئی چیز تعلیلی حکمت اور تکوینی مصلحت سے خالی نظر نہیں آتی۔ تعلیلی حکمتوں کا ایک وسیع کاروبار تمام کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ بقول غالب

یک ذرہ زمیں نہیں بے کار باغ کا　　　　یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

قرآن حکیم نے اس تعلیلی حکمت کی طرف ان بلیغ لفظوں میں اشارہ فرمایا ہے:۔

ربنا ماخلقت ھذا باطلا　　　　ہمارے پروردگار! تو نے یہ عالم کا کاروبار

آل عمران - ع ۲۰　　　　عبث اور بے معنی طور پر نہیں بنایا

چنانچہ ذرہ سے لے کر آفتاب عالم تاب تک اور قطرہ سے لے کر بحر موّاج تک کوئی چیز مصلحتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے معرا نہیں۔

قانون

پھر فطرت کوئی کام غیر معقول یا مستبدانہ انداز سے نہیں کرتی۔ اگرچہ بعض حوادث ہمیں بادی النظر میں عاجلانہ یا تدبر سے خالی نظر آتے ہیں لیکن یہ ہماری کم علمی و کوتاہ نظری کی دلیل ہے۔ فطرت کے قانون بہ الفاظِ دیگر قانونِ الٰہی میں کوئی تبدیلی و تحویل نہیں۔ برگساں نے

جس "ظہور ہدیت" کا ذکر کیا ہے وہ اور مقام کی بات ہے۔ نوامیس فطرت میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اگر ہر روز فطرت کے قوانین متغیر ہوتے تو سائنس کی ترقی بلکہ مہذب و متمدن انسانیت کا قیام محال ہو جاتا۔

پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے اور اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔ ہوا کا دباؤ اور پانی کا حجم قوت، حرارت، حرکت کے قاعدے اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ جہاز رانی، ہوا بازی اور خلا و فضا میں فطرت کے قوانین کی سازگاری موجود ہے۔ قوت مادہ کی صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے اور مادہ قوت کی صورت اختیار کرتا رہتا ہے۔

قرآن حکیم نے فطرت کے قانون کی اس ہمہ گیری اور استمرار و استدام کا اظہار ان لفظوں میں فرمایا ہے:۔

لن تجد لسنة الله تبديلا ولن تجد لسنة الله تحويلا

تسہیل

فطرت کی ربوبیت کا ایک خاصہ تسہیل ہے۔ اگر تسہیل نہ ہوتی تو انسان تمدن کی منازل کو طے نہ کر سکتا۔ مثال کے طور پر اگر دھاتیں سخت حرارت سے پگھل نہ سکتیں تو بے شمار ظروف و آلات بنائے نہیں جا سکتے تھے۔ اسی طرح انسان اور حیوان کے اجسام کی ساخت میں بھی فطرت نے انسان کی ضرورتوں کا خیال رکھا ہے اور یہ کسی انفعالی حس کی وجہ سے نہیں بلکہ حکمت بالغہ و عقلِ کاملہ کی بنا پر ہے۔

تحسین

فطرت کے نظام میں ہر فرد اپنی استعداد کے مطابق تخلیقی قوت رکھتا ہے اور اسی تخلیقی قوت کا ظہور تناسب، اعتدال اور جمالیاتی خیر و خوبی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ چمن میں گلہائے رنگا رنگ کا ظہور حسن و جمال کے تقاضوں سے فارغ نہیں۔ خود فطرت جہاں بھی کام کرتی ہے وہاں حسنِ تعدیل و توفیق کو بغایت ملحوظ خاطر رکھتی ہے۔ جہاں بگاڑ کی صورت پیدا ہوتی

ہے وہ بھی بناؤ کا پہلو اپنے دامن میں لیے ہوتی ہے وفی انفسکم افلا تبصرون
انسان خود اپنے وجود پر جو احسن تقویم ہے نظر کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ جہاں اس کے جسم کی اندرونی ساخت میں فطرت نے حکمتِ بالغہ سے کام لیا ہے وہاں اس کے جسم کی بیرونی ساخت میں حسنِ اعتدال، توفیق اور تزئین و تناسب کو مدنظر رکھا ہے، اور اسی بنا پر قرآنِ حکیم کہتا ہے :-

فتبارک اللہ احسن الخالقین بابرکت ہے وہ بہترین بنانے والا

ارتقا و مقصدیت

کوئی چھوٹی سے چھوٹی مخلوق بھی بے مقصد پیدا نہیں کی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ بعض مخلوقات کی تخلیق کی غرض و غایت ہمیں معلوم نہ ہو۔

کائنات نے موجودہ ترقی یافتہ شکل ارتقا کی بے انتہا منزلوں سے گزرنے کے بعد اختیار کی ہے۔ اور یہ ارتقاء کا عمل ذوقِ جمال سے بہرہ مند ہے۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے :-

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے ظہور کے بعد ارتقا کا عمل معطل ہو گیا اور اب بجز اس کے اور ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ :-

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

لیکن فطرت و مزاجِ کائنات پر عمیق نظر ڈالنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارتقا کا عمل خبط و سقط نہیں ہوا۔ ظاہر کا ارتقاء مثال کے طور پر خلا میں پرواز اور محیر العقول سائنسی ایجادات کا دور ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ اب عروج پر پہنچ رہا ہے۔ اس کے بعد ایک اور باطنی ارتقاء ہے جس کا تذکرہ مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں فرمایا ہے۔

غرضیکہ ابھی تک عالمِ ظہور کے کمالات کے حصول سے انسان فارغ نہیں ہوا، باطنی

کمالات کی ابھی بہت سی منزلیں اسے طے کرنی ہیں۔

بقا و فنا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

حقیقت میں کوئی شے فنا اس معنی میں نہیں ہوتی کہ وہ معدوم مطلق ہو جائے۔ فنا اور بقا وجود کے بطون و ظہور کے دو پہلو ہیں۔ جو بطون میں تھا اس کا ظہور ہوا، جو عالم ظاہر میں ہے وہ بطون کی طرف جا رہا ہے جسے ہم فنا سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ انتقال زمان و مکان سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے اور اسی معنی میں قرآن کہتا ہے ثم الینا ترجعون۔

فنا سے مراد فنائے صوری ہے نہ کہ مادۂ اولیٰ کی فنا۔ انسان جن عناصر یا اجزائے آفرینش سے مرکب ہے ان کی تبعیض ترکیب کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اجسام کے اجزائے ترکیبی فنا نہیں ہوتے، صرف اپنی صورت بدل لیتے ہیں اور جس قوتِ مثالیہ سے ان کا ظہور ہوا تھا وہی قوتِ مثالیہ انھیں کسی اور عالم میں منتقل کر دیتی ہے۔ اس طرح نشست و پراگندگی بالآخر تالیف یا نشاۃ ثانیہ کا ایک ذریعہ ثابت ہوتی ہے اس کا تفصیلی بیان فطرت کے باطنی نظام کے سلسلہ میں آئے گا۔

تعمیمِ نعمت۔

جو چیزیں انسانی حیات کے لیے ضروری ہیں۔ ان کے متعلق فطرت نے نہایت فیاضی سے کام لیا ہے۔ پانی اور ہوا کی نعمتوں کو عام کر دیا ہے۔ اس تعمیم نعمت میں فطرت کا یہ اشارہ پنہاں ہے کہ عام انسانوں کے لیے جس قدر راحت و آسودگی مہیا ہو سکے وہ کی جانی چاہیے۔

ربوبیت مطلقہ نے اپنی نعمتوں میں کوئی امتیاز مذہب، شکل، رنگ روپ کی وجہ سے روا نہیں رکھا۔ یہ امتیازات انسان کی سنگدلی نے پیدا کیے ہیں۔

تعدیل واعتدال

فطرت کے نظام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت غیر معتدل چیزوں کو پسند نہیں کرتی ہے۔ مثال کے طور پر جارحیت ایک غیر معتدل حرکت ہے۔ فطرت نے جارح درندوں اور جارح قوتوں کو خلعتِ بقا سے سرفراز نہیں فرمایا ہے۔ فطرت کا مزاج تعدیل و توفیق کے حق میں ہے۔

پرورش

فطرت نے ہر نوع کی بقا کے لیے برگ و ساز فراہم کیا ہے اور ہر نوع کو اس کے ماحول کی ضرورتوں کے مطابق قابلیتوں سے نوازا ہے۔ پرندوں کو پرواز، بطخ کے بچوں کو تیرنے کی استعداد مرحمت فرمائی ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ فطرت کسی فرد یا کسی کی بقا کے لیے اس درجہ خواہش مند نہیں کہ اپنے نوامیس میں کوئی تبدیلی کر دے۔ فرد یا نوع کو اپنی بقا کے لیے اپنے مزاج اور طبیعت میں اپنے ماحول اور گرد و پیش کے لحاظ سے تبدیلی کرنی چاہیے۔ شرطِ بقا یہی ہے۔

فطرت کی ربوبیت ایک عام رجحان ہے جس میں انفعالی تاثرات کا عمل دخل نہیں ہے۔ یہ الہام فطرت نے شہد کی مکھی کو کیا کہ وہ کس طرح پھولوں سے شہد حاصل کرے اور عنکبوت کو الہام کیا کہ وہ اپنا تار و پود کا گھر کیونکر بنائے۔ مرغی کے بچے کو الہام کیا کہ وہ انڈے کو چیر کر اس میں سے نکل آئے۔ آدمی کے بچے کو الہام کیا کہ وہ روئے اور ماں کی چھاتی سے لگ جائے اور دودھ طلب کرے۔ یہ تمام میلانات طبعی اور رجحانات وجدانی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ فطرت کی ربوبیت فرد کی بقا کے لیے کسی مافوق العادت تکلیف و تکلف کو بروئے کار لاتی ہے۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

فطرت کی شفقت و رافت، ربوبیت و رحمت کے عام معنی کے لحاظ سے ہے لیکن جذبات کے لحاظ سے شفقت و رافت کا تعلق فطرت سے نہیں ہے۔ اس تصور کو شریعت کی اصطلاح میں حیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور بعض طبائع میں یہی کیفیت کفر و الحاد تک پہنچا دیتی ہے۔

غالبؔ نے ایک مقام پر کہا ہے ؎

آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

آہ کی بے اثری اور نالہ کی نارسائی طبعی امور میں جن کے خلاف سے فطرت کا مزاج ناآشنا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ:-

گفتنیہا نیست کہ بر غالب ناکام گزشت
می تواں گفت کہ ایں بندۂ خداوند است

مناسبت و استعداد

اگرچہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے انعامات بلا لحاظ استعداد و قابلیت ہوتے ہیں مگر حقیقت میں یہ بات نہیں ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت صلاحیت و استعداد کو اپنی نعمتوں کی تقسیم میں بغایت ملحوظ رکھتی ہے۔

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی لیکن
تجھ سے کیا ضد تھی جو تو بھی کسی قابل ہوتا

اس سے مراد وہ نعمتیں ہیں جن کا تعلق فطرت کے عطیات سے ہے۔ ان سے مراد انسان کی ساختہ پرداختہ تقسیم مال و دولت نہیں ہے۔

ترتیب و تالیف

فطرت کا منشاء ہے کہ تخلیقی خیر و خوبی کا ظہور ہو۔ اس لیے فطرت کے کاروبار میں ترتیب و تالیف ہے۔ ہم غیر مہذب انسانوں کے کاموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ترتیب کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ علمی طور پر ہی بعض حکماء کے خیالات میں بھی ترتیب نہیں ہے اور وہ کسی علمی نظریہ کو پایۂ تحقیق تک نہیں پہنچا سکے۔ اور اس عدم ترتیب کی وجہ سے ان کے افکار میں تضاد و اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں لیکن فطرت حکمت میں ترتیب، منطقی ترکیب اور توفیق و تطبیق کا خاص اہتمام ہے۔ چنانچہ فطرت کے کاروبار کی ہمہ گیری

اور پھیلاؤ کے باوجود فطرت کا کوئی گوشہ حسن ترتیب و تالیف سے خالی نہیں۔ بہ الفاظ دیگر انسان کے منطقی تصورات خود فطرت کے طبعی اعمال سے ماخوذ ہیں۔

اقتصاد

فطرت کو اسراف اور ضیاع قوت سے بغایت احتراز ہے۔ اس لیے فطرت ہمیشہ وہ راستہ اختیار کرتی ہے جس میں قوت اور حرکت کا ضرورت سے زیادہ استعمال نہ ہو۔ انسان نے علم الاقتصاد کے جو اصول وضع کیے ہیں وہ فطرت کے نوامیس اقتصاد سے ماخوذ ہیں۔ ضیاع اور صَرفِ بے جا سے فطرت کو جو تبعد ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں

فطرت کا مزاج اعتدال و توسط چاہتا ہے۔ ان انواع مخلوقات کے تحفظ اور بقا کا برگ و ساز فراہم کرتی ہے۔ جو افراط و تفریط، زیادتی اور جارحانہ سرگرمی سے حتی الوسع اجتناب کرتی ہیں۔ اس تفاضل و تقابل کے عالم میں اقدار اعتباری و اضافی ہیں۔ اس لیے فطرت کے رنگ رخ کا تعین کیا جا سکتا ہے لیکن کوئی جامد و سخت قانون مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ عدم اعتدال یا عدم اعتدال، جارحیت یا غیر جارحیت کا تصور یعنی اضافی اعتبار سے ہی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر تعصب، تنگدلی اور ناروا داری فطرت کے نظام میں پائی نہیں جاتی، اس لیے انسانی معاشرہ کے لیے بھی یہ دائم و رذائل اخلاق مضر اور خطرناک ہیں۔

رزاقی و جوادی

فطرت کے نظام میں ہر نوع کی مخلوقات کے رزق کا وافر اہتمام ہے۔ انسان جو ارتقائے آفرینش کا منتہا ہے۔ اس کا رزق تو فطرت نے اس فیاضی سے بہم پہنچایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے ایک خوشہ گندم کی کاشت سے ہزارہا خوشہ گندم پیدا ہو جاتے ہیں اور علی ہذا القیاس سبزیوں اور ترکاریوں کا معاملہ ہے۔ زمین کی سطح، زمین کی تہوں، اشجار و اثمار حتی کہ سمندر کی گہرائیوں میں بھی انسان کا رزق موجود ہے۔ انسان کی جامعیت حیوانی اور نباتاتی دونوں قسم کے تغذیہ کی مقتضی ہے۔ اس لیے فطرت کے وسیع کارخانے میں انسان کی غذا کی ان دونوں صورتوں

اور پھیلاؤ کے باوجود فطرت کا کوئی گوشہ حسن ترتیب و تالیف سے خالی نہیں۔ بہ الفاظ دیگر انسان کے منطقی تصورات خود فطرت کے طبعی اعمال سے ماخوذ ہیں۔

اقتصاد

فطرت کو اسراف اور ضیاع قوت سے بغایت احتراز ہے۔ اس لیے فطرت ہمیشہ وہ راستہ اختیار کرتی ہے جس میں قوت اور حرکت کا ضرورت سے زیادہ استعمال نہ ہو۔ انسان نے علم الاقتصاد کے جو اصول وضع کیے ہیں وہ فطرت کے نوامیس اقتصاد سے ماخوذ ہیں۔ ضیاع اور صَرفِ بے جا سے فطرت کو جو تبعد ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں

فطرت کا مزاج اعتدال و توسط چاہتا ہے۔ ان انواع مخلوقات کے تحفظ اور بقا کا برگ و ساز فراہم کرتی ہے۔ جو افراط و تفریط، زیادتی اور جارحانہ سرگرمی سے حتی الوسع اجتناب کرتی ہیں۔ اس تفاضل و تقابل کے عالم میں اقدار اعتباری و اضافی ہیں۔ اس لیے فطرت کے رنگ رخ کا تعین کیا جا سکتا ہے لیکن کوئی جامد و سخت قانون مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ عدم اعتدال یا عدم اعتدال، جارحیت یا غیر جارحیت کا تصور یعنی اضافی اعتبار سے ہی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر تعصب، تنگدلی اور ناروادار فطرت کے نظام میں پائی نہیں جاتی، اس لیے انسانی معاشرہ کے لیے بھی یہ ذمائم و رذائل اخلاق مضر اور خطرناک ہیں۔

رزاقی و جوادی

فطرت کے نظام میں ہر نوع کی مخلوقات کے رزق کا وافر اہتمام ہے۔ انسان جو ارتقائے آفرینش کا نقطہ ہے۔ اس کا رزق تو فطرت نے اس فیاضی سے بہم پہنچایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے ایک خوشہ گندم کی کاشت سے ہزار ہا خوشہ گندم پیدا ہو جاتے ہیں اور علی ہذا القیاس سبزیوں اور ترکاریوں کا معاملہ ہے۔ زمین کی سطح، زمین کی تہوں، اشجار و اثمار حتی کہ سمندر کی گہرائیوں میں بھی انسان کا رزق موجود ہے۔ انسان کی جامعیت حیوانی اور نباتاتی دونوں قسم کے تغذیہ کی مقتضی ہے۔ اس لیے فطرت کے وسیع کارخانے میں انسان کی غذا کی ان دونوں صورتوں